اجیت کور کے ناول "گوری" میں سماجی استحصال کا مطالعہ

نگہت نورین☆/ڈاکٹر فوزیہ اسلم☆☆

The study of social Exploition in the Novel "Gon" of Ajeet cour

Nighat Noreen
Dr Fozia Aslam

Abstract:
Ajeet Cour is considered on top as social realists.Social problems, men and women relation and describe their social conditions, she is top of all writers. She is novelist, columnist and story teller too. During study she being familiar with the ideology of Karl Marx. Few expure of bitter realities about life were disclosed. After this her writings became evident and encompassed the issues of poor and socially deprived persons in reknown manners.Every one is very well aware that human being done several efforts and trials for the survival.When Adam's sibling took first step to the earth,His first source of income was agriculture.Initial era they lived in form of group,as seemed to help eachother was build in his nature.Society formed from, group to tribes and tribes to society.During all this ,several systems were introduced.Behalf of these systems, masters &servant, rich & poor,feudalists & peasant,industrialists & labour such the categories was brought forth.After exposition of these categories, the person was against to each other.

Key words:
Gon, social, realis, class, difference, Exloitation, marzism

کلیدی الفاظ:

گوری، سماجی حقیقت نگاری، طبقاتی کش مکش، استحصال، مارکسی تناظر

اجیت کور کو کم عمری میں ہی ایسا کام کرنے میں فخر محسوس ہوا جس میں سماجی فلاح کا پہلو نمایاں تھا۔ شاید یہ ان کی بعد میں آنے والی تحریروں کا ابتدائی دور تھا کہ کہانی کہیں ان کے لاخاص

☆ پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد
☆☆ استاد شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد

قسم کی گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔ ان کی پیدائش پاکستان میں ہوئی اور ماندہ زندگی بھارت میں گزری۔ مگر آج بھی وہ اپنی ذات کی جڑیں لاہور کی سرزمین میں گڑھی ہوئی محسوس کرتی ہیں۔ پنجابی زبان پر عبور کم عمری میں ہی حاصل کر لیا، محض آٹھ برس کی عمر میں "ہیر رانجھا"، "سسی پنوں"، "سوہنی ماہیوال" اور "مرزا صاحبہ" وغیرہ کے قصے روانی اور سلاست کے ساتھ پڑھ لیا کرتی تھیں۔ ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں انہوں نے بدھی مائی (گریجویشن) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ کم عمری میں گریجویش کرنے والی یہ واحد طالبہ تھیں جن کا ریکارڈ آج تک قائم ہے۔

اجیت کور کے سفر زیست میں بے پناہ اونچ نیچ کے مراحل آئے۔ مگر بہت باہمت ٹھہریں اپنے درد میں لوگوں کے دکھوں کو محسوس کیا اور ایک سماجی فلاحی ادارہ قائم کیا جس میں کام کرنے والی غریب لڑکیاں اپنا اور اپنے خاندان کا بوجھ بآسانی اٹھا سکتی ہیں۔ وہ کالم کے ذریعے بھی عورتوں کے مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی "خانہ بدوش" کے نام سے لکھی گئی سوانح عمری اپنی نوعیت کی منفرد تحریر ہے۔ ان دنوں وہ اکیڈمی آف فائن آرٹس اینڈ لٹریچر نئی دہلی کی چیئر پرسن کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ان کی خدمات اور کام کی بناء پر انہیں متعدد اعزات سے نوازا گیا ہے۔ جو کہ درج ذیل ہیں :

Shiromani Sahitkar Award :1979
International IATA Award : 1984
Sahitya Akadmin Award :1985
Bharatiya Bhasha Parishad Award :1989
Punjabi Sahita Sabha Award :1989
Civilian Award of Padma Shiri: 2006

سماجی حقیقت پسندی کی سیاسی تحریک اور فنکارانہ تحقیقات بنیادی طور پر ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے دوران شروع ہوئی۔ اصلاً یہ اصطلاح فرانسیسی ادب میں ایک خاص اسلوب نگارش اور تصور لیے ہوئے ہے۔ متعدد محققین بالزاک کو اس تحریک کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ بالزاک کے بعد انیسویں صدی کے عظیم فرانسیسی ناول نگار فلائیبر کو اس تحریک کا بانی مانا جاتا ہے۔ ان کا مشہور و معروف ناول "مادام بواری" حقیقت نگاری کا حسین مرقع ہے، فلائیبر کے بعد ایمل ژولاں کا نام ہے۔ انھوں نے معاشرے میں خاندان کے مسائل اور رشتوں پر کم و بیش بیس ناول لکھے۔

یورپ میں سماجی حقیقت نگاری (social realism) انیسویں صدی کے نصف آخر میں منظر عام پر آئی۔ اس بات سے ہر ذی شعور بخوبی واقف ہے کہ کوئی بھی تحریک جس کا تعلق ادب سے ہو وہ حقیقت سے خالی نہیں ہوتی۔ کسی نہ کسی طور انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کی رومانوی تحریک نے عوام الناس میں جو جذباتیت موج کی کیفیت پیدا کی

اس سے تخیل میں ایک خاص قسم کے ہیجان نے جنم لیااور زندگی کی بے رحم حقیقتوں نے رومانویت کی اسفضا پر غلبہ حاصل کر لیا۔

کہاجاتاہے کہ قدیم انسان کی کشمکش قدرتی آفات موسموں کی ناموافقت اور اس ماحول میں اپنی بقا قائم رکھنے کے جنگ تھی۔ یہ سفر اگرچہ کٹھن بھی تھااور طویل بھی لیکن تنہائی کے کرب سے نکل کر جب اس نے گروہ کی شکل اختیار کی تو ناممکنات خود بخود ممکن ہوتے چلے گئے۔ یہ انسانی گروہ جب بڑی سطح پر منظم ہوئے تو سماج کی شکل اختیار کی۔ سماج کی صورت میں باقاعدہ زندگی کا انتظام وانصرام چلنے لگا، قوانین اور اصول وضع کیے گئے۔

ابتدائی دور میں انسانی سماجوں میں اجتماعیت اور اشتراکیت کا عنصر غالب رہا۔ اور غالباً یہی انسانی زندگی کی بقاکا ضامن بھی تھا۔ سماج اپنے خاص ارتقائی سفر کے مختلف ادوار میں متعدد نظاموں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا۔ ان نظاموں میں غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری وغیرہ شامل تھے۔ قبائلی ادوار میں انسان نے اجتماعیت اور اشتراکیت کو اپنی بقاء کا ضامن سمجھا۔ قبائلی ادوار کے بعد جب غلام داری، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کا دور رائج ہوا تو معاشرے اور فرد کے مابین تعلقات معاشی بنیادوں پر بدلنے شروع ہوگئے۔ اس طرح پیداوار اور اس کے ذرائع پر قبضے کی بناپر فیصلہ سازی کا عمل شروع ہوا۔ جو انسانی استحصال کی بنیاد بنا۔ یہاں سے انسانوں کا استحصال انسانوں ہی کے ذریعے شروع ہوا۔

لفظ "استحصال" انگریزی کے لفظ (exploitation) کا متبادل ہے یہ معاشیات کی اصطلاح ہے۔ جس کے معنی "حصہ داری کے کام میں دوسرے کا حصہ ہتھیانا، فائدہ حاصل کرنا، ناجائز فائدہ اٹھانا وغیرہ ہیں۔ استحصال کے لیے جھپٹ، چھین، خود مطلبی، طلب اور حصول وغیرہ کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور سے آج تک انسانی استحصال کی بنیاد کسی بھی معاشرے میں پیدا ہونے والی معاشی ناہمواریاں رہیں۔ جب دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہوئی اور بورژوا کے پاس دولت اور پرولتاریہ کے حصے میں صرف مزدوری آئی تو معاشرے میں ایک طبقہ غریب سے غریب تر اور دوسرا امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا۔ انسان نے اپنی لالچ کے زیر اثر آکر انسان کی پہچان کرنا چھوڑ دی وہ درندگی کے اس دور میں واپس چلا گیا جہاں سے معاشرتی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی۔ معاشی ناہمواریوں کی بدولت معاشرے میں ذہنی، جسمانی، سماجی اور معاشی استحصال کی صورتیں سامنے آئیں۔

اجیت کور کی تحریروں میں جابجا استحصال کی تمام صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مصنفہ کا تعلق معاشرے کے حساس طبقے سے ہے۔ جو معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف قلم کے ذریعے صدا

بلند کرتا ہے۔ اپنی اس صدا کی بدولت آیندہ آنے والی کئی نسلوں کے لیے سمت و جہت کے نئے راستے متعین کرتا ہے۔ اس کا مطمع نظر معاشرے میں پھیلی بے ثباتی، ظلم، تشدد اور جبر کی فضا کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کو قاری کے سامنے لانا ہوتا ہے۔

"گوری" ناول میں ایک جانب عورت کے استحصال کی درد بھری داستان رقم کی گئی ہے تو دوسری طرف غربا کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے جو بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں جنھیں اپنے ارد گرد کی دنیا میں ہونے والے انقلابات سے ذرا برابر بھی واقفیت نہیں۔ گوری ایک انتہائی غریب گھرانے میں دو بہنوں کے بعد پیدا ہوئی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کے باپ نے اسے بابو رام کو دے دیا جو گاؤں میں سڑک بنوانے کی غرض سے ٹھیکہ لیتا ہے۔ بابو رام اپنے سسر کے گھر میں رہتا ہے اور اسی کا کاروبار چلاتا ہے۔ اس لیے اپنی بیوی سشیلا سے ڈرتا ہے۔ گوری کے حوالے سے اپنی بدنیتی بیوی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب گوری اس کی ہوس کے نتیجے میں شنکر کو جنم دیتی ہے تو بابو رام سشیلا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ سشیلا کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ اس طرح گوری شنکر سے بابو رام کی رکھیل کے طور پر متعارف ہوتی ہے۔

اجیت کور نے جس انداز میں گوری کے درد کو بیان کیا ہے وہ انسانی جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ گوری ایک معصوم بچی سے غلام کیسے بنتی ہے اور غلام سے ماں تک کا سفر کن اذیت ناک مدارج سے طے کرتے ہوئے ایک بار پھر غلام کا روپ دھار کر اس کی ذات اسی کے لیے ایک گالی بن جاتی ہے۔ اس کی ذات کا استحصال ہر ایک سطح پر ہوتا ہے چاہے وہ جنسی، ذہنی، معاشرتی یا معاشی سطح ہو، اسے اپنی ذات پر لگی ایک گالی کی چھاپ ہر سطح پر دکھائی جاتی ہے۔ وہ کسی روپ میں بھی قابل عزت نہیں کیوں کہ وہ ایک عورت ہے۔

> "گوری دل دہلا دینے والا ایسا ناول ہے جو انسانی جذبات و احساسات کو جھنجھوڑ دینے کی قوت رکھتا ہے اور اپنے انسانی رشتوں کی تقدیس اور حیوانی جذبات کے درمیان ایک لرزہ خیز مکالمہ چھپائے ہوئے ہیں"(۱)

گوری پیدا ہوتے ساتھ ہی باپ کے لیے گالی بن جاتی ہے۔ نہ صرف باپ بلکہ ماں بھی اس کے مرنے کی دعائیں مانگنے لگتی ہے۔ گوری نے اس دنیا میں اس وقت آنکھ کھولی جب اس کے باپ کو بیٹے کی شدید خواہش تھی۔ گوری سے قبل اس کے ماں باپ دو بیٹیاں پیدا کر چکے تھے اس لیے انھیں تیسری کی خواہش نہ تھی۔ چناں چہ اس کا باپ گردھر اسے بھگوان کی بد دعا سمجھتا تھا۔ وہ ساری حیاتی ہانپتے کانپتے بسر کرتی چلی گئی۔ اس پر ہونے والے ستم میں زمانے کا کیا قصور کہ جب اس کا اپنا باپ جس کے وجود کا وہ حصہ تھی وہی اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔

گوری کی چاچی سب لوگوں سے چھپ چھپا کر اسے کھانے کو روٹی دے دیا کرتی۔ ابھی بمشکل وہ آٹھ برس کی ہو گی کہ ان کے گاؤں سے کچھ فاصلے پر سڑک بنانے کا کام شروع ہوا تو گاؤں کے لوگوں کو بھیڑیں چرانے اور مرغ پالنے کے علاوہ بھی کوئی کام دکھائی دیا۔ چناں چہ بچے، بوڑھے، جوان سبھی مزدوری کرنے نکل پڑے۔ بچوں سے روڑی کوٹنے کا کام لیا جاتا۔ گوری بھی قبیلے کے باقی بچوں کے ساتھ مل کر روڑی کوٹنے میں لگ گئی۔ اور نہیں تو مزدوری کر کے شاید اس کا باپ اسے بھگوان کی بد دعا کا روپ نہ سمجھے۔ کام کے دوران بابو جس کے پاس سڑک بنوانے کا ٹھیکا تھا اپنے مالک کی بیٹی سے مجبوری میں شادی کی، مگر دولت کی بناء پر بے جوڑ رشتے کو نبھانے پہ مجبور تھا۔ جب گوری کو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو ایک دم سے قیاس کرتا ہے کہ:

"رب نے کیسے گدڑی میں نگینے جڑ دیے۔۔۔ اتنی خوبصورت لڑکی جب اس کے بیٹے کو جنم دے گی تو وہ بالکل چاند کا ٹکڑا ہو گا"۔[۲]

اپنے تخیل کی دنیا بسائے نجانے بابو رام کتنا آگے نکل جاتا کہ ایک دم سے سشیلا کا خیال آنے پر خوابوں سے حقیقت کی جانب لوٹ آیا اور اس کی کمین اور لاچار لڑکی کو اپنانے کے لیے جال بننے لگا۔ بالآخر ایک رات اس کے باپ کو چند روپوں کے عوض یہ کہہ کر منا لیا کہ شہر لے جا کر اسے اپنی بیٹی بنائے گا۔ غربت سے بڑی ذلت انسانی زندگی میں کوئی شے نہیں۔ یہ ایسی رذیل اور گھٹیا چیز ہوتی ہے کہ انسان کو بھی ضرورت کے وقت درندہ بنا دیتی ہے۔ کمتر سماجی حیثیت اس کا بیٹی ہونا ہی جرم تھا اور اس وقت وہ مزید بے وقعت اور قابل رحم ہو جاتی ہے جب اس کا باپ ایک غیر شخص کے ہاتھوں اس کا ہاتھ بنا کسی پوچھ گچھ کے محض غربت سے تنگ آ کر دے دیتا ہے۔

بابو رام اپنی بیوی کو اس کی خدمت گار بتاتا ہے اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ مرد عورت کو استعمال کرنے کے کتنے طریقے جانتا ہے۔ بابو رام اپنی خواہش کی تکمیل میں سشیلا کو بھی منا لیتا ہے۔ مرد کی سوچ کو اجیت کور کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہیں۔

"بیوی کو گھر کی چابیوں کا گچھا پکڑا دیں جسے وہ اپنی ساڑھی کے پلو کے ساتھ باندھ کر کاندھے کے اوپر سے پیٹھ پیچھے جھلا سکے۔ اس کی ساری تسلی، سارا اطمینان، سارا غرور اسی گچھے میں سما جاتا ہے۔ باقی پھر جو چاہے کریں"[۳]

قانون فطرت ظالم ہوتا ہے مگر انسان اس سے کہیں زیادہ ظالم و جابر ہے۔ فطرت کی جانب سے آفات و آزمایش کا سلسلہ شروع ہوا تو سبھی کے لیے برابر ہوتا ہے۔ مگر انسان کے ہاتھ میں آنے کے بعد صرف غریب ہی پستا ہے۔ دولت کا قانون غریبوں کے لیے زندگی جینا دوبھر کر دیتا ہے۔ زر کا نشہ امرا کے دماغوں میں غرور و تکبر پیدا کر دیتا ہے۔ غریب انسان کے لیے کوئی

رشتہ نہیں ہوتا جب جس کا دل کرے اسے گالی دے اور دھتکار دے اس بے بس کا استحصال ہر سطح پر ہوتا ہے۔

گوری بابو رام کے بیٹے شنکر کو جنم دیتی ہے اور اسی کے وجود کا حصہ دولت کے نشے میں اپنی ہی ماں کو درندگی اور ہوس کا نشانہ بناڈالتا ہے۔ اس طرح عورت کی نا آسودگی اور مظلومیت کی ایک انوکھی داستان رقم کی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون فطرت میں استحصال کی یہ کونسی صورت ہے؟ اسے کونسا نام دیا جائے؟ شنکر جسے گوری نے اپنے خون سے سینچا تھا، آج وہ ننھا پودا جب تناور درخت بنا تو اس پر سایہ کرنے کے بجائے کانٹے برسا گیا۔ یہ قانون فطرت نہیں کیوں کہ فطرت کے تو اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا بنایا قانون ہے جس میں درندگی اور بربریت کی کڑیاں ایک تسلسل کے ساتھ جڑی دکھائی دیتی ہیں۔ اجیت کور نے اپنے اس کردار کے ذریعے عورت کی ابتر سماجی حالت، اس کا معاشی، جنسی اور نفسیاتی سطح پر استحصال، والدین کی جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرنے میں اس کے جذبات کی قربانی اور معاشرت میں اس کی ثانوی حیثیت کو انوکھے انداز میں رقم کیا ہے۔ اپنی کم مائیگی کی بنا پر زندگی کے بازار میں وہ جگہ جگہ جنسی تجارت کا سامان بنتی دکھائی دیتی ہے۔ گوری کی خاموشی، قربانی اور بے چارگی میں بھی اس کی ذات عظیم دکھائی دیتی ہے۔ مصنفہ کا کمال بلاشبہ قابل تعریف ہے کہ انھوں نے اس انداز میں حقیقت کو بیان کیا کہ نام نہاد عزت دار طبقہ کی تمام چالبازیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

ادب کی روایت میں عورتوں نے بھی لکھا اور مردوں نے بھی مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عورت کے بارے میں اگر عورت لکھے تو اس کے وجود کے معتبر ہونے کی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں

> "وہ جو کہتے ہیں گھائل کی گھات گھائل جانے، تو اس لحاظ سے عورت سے بڑھ کر عورت کی تصویر کشی کون کر سکتا ہے۔"(۴)

اجیت کور کے ہاں گوری کا کردار سچا سُچا اور جیتا جاگتا ملتا ہے۔ ان کا کردار اپنی معصومانہ خصلتوں اور سر تا پا قربانیوں کا مجسمہ بن کر سامنے آتا ہے تو قاری سے لاتعداد ہمدردیاں سمیٹ لینے کے بعد رائج شدہ نظام میں تبدیلی کا جذبہ بھی پیدا کر جاتا ہے۔ تمام ظلم و ستم اور کٹھن حالات میں جینے کا سہارا ایسا اوقات چند انسانی رشتے ہوتے ہیں۔ مگر وہی رشتے اگر درندگی اور سفاکی کا روپ دھار لیں تو انسان کی کم مائیگی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ گوری بیٹی کے روپ میں سر تا پا ایثار تھی۔ اس نے بیٹی ہونے کے تمام فرائض نبھائے۔ باپ کے کہنے پر ایک انجان شخص کے ساتھ بنا کسی سوال کیے چل پڑی۔ اپنی عزت گنوادی، ذلت کی زندگی گزاری۔ کسی نے ہمدردی کی تو کسی نے زخم دیے۔

زندگی کی کانٹوں بھری شاہراہ پر چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو گئے۔ عمر نے چالیس برس بعد جب اپنے مسکن میں واپس لوٹنے کا قصد کیا تو ایک ہی ماں جایا اسے پہچاننے سے انکاری تھا۔ اس کا وجود گالی تو تھا ہی، واپس اسی جہنم میں آ گئی۔ کیا تھا اگر اس کے بھائی اسے بہن کہہ کر صرف ایک بار جھوٹے منہ اندر بلا لیتے تو آج اس کا اپنا ہی بیٹا یوں عزت کا کھلواڑ نہ کرتا۔

وہ گوری جس نے اس گھر کی چار دیواری سے باہر کبھی جھانک کر نہیں دیکھا تھا آج لُٹنے کے بعد چپ چاپ وہاں سے نکل گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جائے گی۔ وہ تو وہاں کے لوگوں کی زبان تک سے ناواقف تھی۔ اس نے ساری زندگی ڈرے سہمے گزار دی۔ باپ سے لے کر بیٹے تک ہر مرد سے ڈرتی رہی۔ اور آج اس کے بیٹے نے اسے وراثت میں ملی ہوئی ایک شے تسلیم کر کے استعمال کر کے اس کے وجود کو کوڑے کا ڈھیر بنا دیا۔ ناول سے اقتباس:

> "مجھے نہ پوچھیں، وہ عورت کہاں جائے گی مجھے نہیں معلوم۔۔۔ وہ کس سمت میں چلے گی اور کہاں پہنچے گی۔۔۔ مجھے صرف اس بات کی تسکین ہے کہ گوری اپنے خول کو توڑ کر، زور لگا کر، فیصلہ کر کے باہر نکل آئی۔ یہی سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ زور لگانا، خول کو توڑنا، فیصلہ کرنا، اور منتخب کر لینا کہ چلنا ہے۔۔۔ زندگی چل پڑنے کا نام ہے چل پڑنا ہی اہم بات ہے پہنچنا ضروری نہیں۔"(۵)

گوری نے باپ کی دہلیز چھوڑی تو زبان کو وہیں چھوڑ آئی۔ پہلے بھی باپ دادا کے ڈر سے کم ہی بولتی تھی مگر جب بابو رام کے ساتھ آئی تو زبان کے اختلاف کی بنا پر بولنا ہی چھوڑ گئی۔ خود پر ہونے والے ہر جبر کو گُنگ ہو کر برداشت کرتی رہی مگر آج اس کے اندر کے انسان نے اسے جھنجھوڑ دیا اور وہ تمام سلاخیں توڑ کر باہر نکل آئی۔ کہاں جائے گی اس سے قطعی ناواقف۔۔۔ گوری کا دکھ محض ایک بیٹی یا ماں کا ہی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کی ماؤں بیٹیوں کے حالات کا عکاس ہے۔ اس دن وہ ایک ہی نہیں نجانے کتنی ماؤں کے دل خون کے آنسو روئے ہوں گے۔ کتنے رشتوں کا تقدس پامال ہوا ہو گا۔ کتنی ماؤں نے اپنے خون پر سے اعتماد گنوایا ہو گا۔ کتنی ماؤں نے اپنی کوکھ کے اجڑ جانے کے لیے جھولیاں پھیلائی ہوں گی نجانے کتنی؟

اس ناول میں جہاں ایک عورت کے سماجی استحصال کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ وہیں غریب طبقے کا امراء کے ہاتھوں معاشی و معاشرتی استحصال کی صورتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات اس سے قبل بیان ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی کی بقاء کا ضامن انسانی سماج میں اشتراکیت اور اجتماعیت کا عنصر تھا۔ مگر گزرتے وقت کے ساتھ جب سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام متعارف ہوئے تو انسان نے ایک دوسرے کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ اس استحصال کی بنیادی وجہ اشیا کو

اپنی تحویل میں لے کر حق ملکیت جتانا تھا۔ چنانچہ ملکیت اور قبضے کے اس شعوری فیصلے کے ساتھ ہی اسے مستحکم و مضبوط رکھنے کی خواہش نے جنم لیا۔ اس خواہش کو عملی صورت میں ڈھالنے کے لیے جن شعوری کوششوں کا استعمال کیا گیا اسے سیاسی کشمکش کا نام دیا جاتا ہے یہی سیاسی کشمکش بعد میں طبقاتی کشمکش کہلائی۔ تمام انسانی معاشروں کی ترقی اسی کی بدولت ممکن ہوئی۔ طبقات کی اس کشمکش کے نتیجے میں دو انسانی طبقات امرا اور غربا سامنے آئے۔ امرا نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے غربا کا استحصال کیا۔ انھیں جابجا استعمال کر کے ترقی کے زینے چڑھتا چلا گیا اور غریب طبقہ ظلم کی چکی میں پستا چلا گیا۔ ان کی نجانے کتنی نسلیں یوں ہی حسرت و یاس کی تصویر بنے کام کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور آج بھی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اجیت کور نے اس ناول میں نچلے طبقے کا امرا اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہونے والے استحصال کو عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کس طرح یہ طبقہ دن بھر محنت مزدوری کرتا ہے اور صنعتی و اقتصادی کشمکش انھیں نڈھال کر دیتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ اولاد آدم ایک ایک نوالے کو ترستی ہے۔ بھوک ننگ ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے۔ گوری کے باپ دادا سمیت متعدد گاؤں کے لوگ اس بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹکتے ہوئے زندگی گزارتے آئے ہیں۔ کسی نے اگر کبھی اپنی اصل سے دور بھاگنے کی کوشش بھی کی تو واپس اسی دلدل میں آ گرا۔ اس کا باپ بھی غربت سے دور بھاگ جانے کی ایک ناکام کوشش کر چکا تھا۔

غریب انسان دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والی ترقی پر کوئی حق نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی ریت کے ٹیلوں کی مانند ہے جسے نہ تو کسی طرح خود سے بنایا جا سکتا ہے نہ جھاڑا جا سکتا ہے۔ یہاں انسان کی محنت کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ ہزارہا موسموں کے آنے اور بیت جانے کا انسانی زندگیوں پر اثر پڑتا ہے۔ صدیاں بیت جاتی ہیں دنیائے انسانی کے تمام ملکوں کی تاریخیں کروٹ لیتی ہیں۔ انسان اپنے آرام کی تلاش میں کوششیں و کاوشیں کرتا ہوا ترقی کی متعدد منازل طے کرتا ہے۔ کہیں فتح حاصل کر کے اپنا تسلط قائم کرتا ہے تو کہیں شکست کھا کر نام و نشان مٹا بیٹھتا ہے اور اس طرح ایک نئی تہذیب جنم لیتی۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک بننے اور مٹنے کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے لیکن اس سارے عمل اور گردش میں کوئی ایک علاقہ چھوٹ جاتا ہے جس کی جانب نہ تقدیر ایزدی کی نظر جاتی ہے اور نہ انسان کی، تقدیر کا جبر شاید اسی کو کہا جا سکتا ہے۔ اسی تقدیر کے جبر کے ساتھ انسان کا جبر و تشدد بھی مل جائے تو کیفیت ناقابل بیان ہو جاتی ہے۔ زندگی ریت اور خشکی کا ملاپ ہو تو نحوست کا روپ دھارتی ہے جس پر نہ پانی کا کوئی چھینٹا پڑ کر اس کی نحوست کو دھو سکتا ہے اور نہ اس

میں نرمی پیدا کر سکتا ہے۔ سخت دل، سخت جان لوگ اپنی غربت سے پیچھا چھڑانے کے لیے گھروں سے بھاگ بھی جائیں تو ان کا استحصال پھر بھی ہوتا ہے۔ کہیں تقدیر کے ہاتھوں تو کہیں سرمایہ داروں کے ہاتھوں۔

"ہم جیسے مزدور لوگوں نے ہڈیاں ہی گھسانی ہیں۔ کیا شہر اور کیا گاؤں"(۶)

غریب اور مزدور طبقہ کا ہر جگہ استحصال ہوتا رہا ہے اور آج بھی اس کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ اس بات سے خود بھی یہ طبقہ بخوبی آگاہ ہے۔ سب سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود بھی وہ ایسی ذلت زدہ زندگی کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ یہاں انسانی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سماجی شعور رکھنے کے باوجود بھی یہ لوگ اپنے حقوق کے لیے صدا بلند نہیں کر پاتے۔ آخر کیوں؟ جانچ پرکھ کے بعد متعدد وجوہات سامنے آتی ہیں سب سے بڑی وجہ تو خود اس طبقے میں پھیلی نا اتفاقی ہے۔ دوسری وجہ بھی اسی تسلسل کی کڑی ہے کہ سرمایہ دار انھیں کسی سطح پر متحد ہونے نہیں دیتا۔ وہ اپنی چالبازیوں اور چالاکیوں کے جال کو اس طرح بُنتا ہے کہ غریب بیچارہ اس جال کے ذریعے غربت کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ وہ اسی طبقہ کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اس پر چند مراعات نچھاور کرتا ہے اور مراعات کے ساتھ ہی اس کی زندگی کو اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے۔

گاؤں میں بننے والی سڑک بھی کچھ ایسی ہی کہانی کا منظر پیش کرتی ہے۔ ایسا علاقہ جہاں لوگوں کو دن بھر کھانے کے لیے موٹا چاول اور پینے کے لیے تاڑی ملتی ہے۔ وہ بھی محض بھوک دبانے کے کام آتے ہیں مٹانے کے نہیں۔ ایسے حالات میں وہاں سڑک کا بننا ایک غیر ضروری بات لگتی ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ترقی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کیوں کہ اس حقیقت سے بھی انحراف ممکن نہیں کہ بھوکے پیٹ نہ ترقی کی باتیں سن سکتے ہیں اور نہ ہی سرمایہ دار سے روابط بڑھانے کے لیے شہر کا قصد کرنے کی کوئی راہ تلاش کی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں وہ کلمات صادق آتے ہیں کہ بھوکے سے جب پوچھا گیا کہ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں اس نے برجستہ جواب دیا "چار روٹیاں" اقتباس:

> "قبیلوں کے لوگ حیران تھے کہ سڑک بنا کر کیا کرے گی سرکار؟۔۔۔ سڑک پر موٹریں چلا کر سرکار ان کے قبیلوں میں آنے سے تو رہی۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ سرکار انہی روپوں کے چاول ہی بھیج دیتی ان کے لیے۔۔۔ سڑک کے ساتھ کسی کا کیا تعلق واسطہ ہے!"۔(۷)

ناول کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو اس میں جہاں کہانی کا ایک رخ عورت کے استحصال کی دردناک داستان بیان کرتا ہے وہیں دوسری جانب غریب، مزدور اور محنت کش طبقہ کی زندگی کی

المناک کہانی بھی ہے۔ راجستھان میں ایک گاؤں کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس داستان میں عورت آج بھی بچے پیدا کرنے کی مشین بنی دکھائی دیتی ہے۔ حوا کی یہ بیٹی آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی بحیثیت انسان کوئی سماجی پہچان نہیں رکھتی۔ ریت سے جنم لینے والی اس عورت کو آج بھی ہنسنے کی پاداش میں کاٹ ڈالنے کا عندیہ دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں عورت پر ہونے والے ظلم و جبر کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ بربریت کے اس فعل کو دیکھ کر حیوانیت بھی شرم سے منہ چھپا لیتی ہے۔ دوسری جانب غریب طبقہ امرا کے ہاتھوں جابجا استحصال کا نشانہ بنتا ہے۔ یہاں طاقت ور طبقے کے ہاتھوں غریب کی کسمپرسی کو بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طبقے کی خوشیاں اور مسرتیں ایک سراب کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔

مجموعی طور پر اجیت کور اپنی تحریروں کے ذریعے سماجی مسائل کو پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت اور مرد کے تعلقات، مسائل کی سماجی صورتِ حال، سرمایہ دار کے ہاتھوں غربا کا استحصال اور آئے دن ختم ہوتے اخلاقی اقدار کے عمدہ مرقع ملتے ہیں۔ ان کے ہاں عورت کا دکھ درد جس طرح سے بیان کیا جاتا ہے وہ کسی ایک عورت کا درد نہیں رہ جاتا۔ تمام عالم انسانی کی عورتوں کا درد بن کر ابھرتا ہے، یہ عورت کے وجود سے وابستہ ایسا درد ہے جس سے وہ کسی طور فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ بحیثیت عورت انھوں نے عورت کے درد کو بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنی کہانی میں جس طرح وہ عورت کے استحصال اور بے حرمتی کا تذکرہ کرتی ہیں۔ وہ قاری میں اشتعال کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ بلاشبہ مرد حقیقت نگار بھی اپنی تحریروں کو عمدہ انداز میں لکھتے ہیں، لیکن خاتون ہونے کے ناطے وہ اس تعلق اور احساس کو زیادہ گہرائی کے ساتھ رقم کرتی ہیں کہ ان کے مقابلے میں اگر مرد لاکھ فلسفہ اور نفسیات بھی پڑھ لے تو بھی ان احساسات اور تعلقات کو بیان نہیں کر سکتا جو ان کے ہاں ملتے ہیں۔ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاں گہرا مشاہدہ، نفسیات سے آگاہی اور عام بول چال کی زبان کے متنوع لہجوں پر عبور واضح دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اجیت کور، گوری، (مترجم) خالد محمود، موڈرن پبلی کیشننگ ہاؤس، نئیدہلی، ۲۰۰۱ء، ص:۵

۲۔ اجیت کور، گوری، (مترجم) یاسر جواد، فکشن ہاؤس ۱۸۔ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۵۳

۳۔ ایضاً: ص:۸۰۔۷۹

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء، ص:۱۳۳

۵۔ اجیت کور، گوری، ص:۱۳۵۔ ۱۳۴

۶۔ ایضاً، ص:۲۸

۷۔ ایضاً، ص:۲۸